Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق

ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972

VOL 6, Issue 4

www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

Research Article

ڈاکٹرارشد محمود ناشاد[1]

ایسوسی ایٹ پروفیسر، چیئرمین شعبہ اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

پروفیسر نظیر صدیقی کی ادبی جہات

Dr. Arshad Mahmood Nashad

Associate Prof , Chairperson Department of Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad

Received: Oct 2, 2025

Accepted: Nov 20 2025

Published: Dec 30, 2025

Literary Aspects Of Professor Nazeer Siddiqui

Prof. Nazeer Siddiqui is a reliable name among the personalities of the modern era who have increased their extraordinary abilities in various fields of literature. Prof. Nazeer Siddiqui was truly a multifaceted personality. Along with teaching of literature, he added his name to the architects of modern Urdu literature by performing many exemplary works in poetry, criticism, column writing and essay writing.Prof. Nazeer Siddiqui's literary development took place in Dhaka under the supervision of Dr. Andaleeb Shadani. He created his own style in criticism, essay writing and poetry. His criticism is not subject to any well-known critical school. Although he was initially influenced by the progressive movement, his criticism is different from the progressive criticism. He is not anti-traditional like the Arbab-e-Zoq circle. Unlike the modernists, Nazir Siddiqui loved the healthy values of tradition. Therefore, it had nothing to do with modernity.Nazeer Siddiqui also made his own way in light essay. Like Dr. Wazir Agha and Mashkoor Hussain Yad, he founded a separate school of light essay. Nazeer Siddiqui's light essays, despite their satire and elegance, do not become sarcastic and humorous essays. The beauty of the language and the quality of expression give a distinct flavor to his compositions . Nazir Siddiqui preferred the genre of ghazal in poetry to convey his passion and feelings. In his ghazal, the color of happiness is dominant, but other colors of life are also present in it . In the article under review, Professor Nazir Siddiqui's all-round literary services have been introduced and his services have also been acknowledged.

Keywords: Literature, Ghazal, Humorous Essays, Elegance, Wazir Agha,

پروفیسر نظیر صدیقی کا شمار ایسے صاحبانِ کمال میں ہوتا ہے جنھوں نے زندگی کا بڑا حصّہ علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور درس و تدریس میں بسر کیا۔ اُن کی ادبی شناخت کا اہم تر حوالہ اُن کی تنقید ہے تاہم انشائیہ نگاری، کالم نگاری اور شاعری کے شعبوں میں بھی اُن کے کارنامے اپنا انفرادی رنگ و آہنگ رکھتے ہیں، جنھیں ادبی دُنیا میں اعتبار حاصل ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی ایک اُستاد کی حیثیت سے بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے ڈھاکا، کراچی اور اسلام آباد کے مختلف اداروں میں درس و تدریس کے فرائض جس جذب و شوق سے انجام دیے، اس سے اُن کی اس شعبے کے ساتھ گہری وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ مشرق و مغرب کے بڑے ادب کے گہرے مطالعے اور اس پر مسلسل غور و فکر کے نتیجے میں اُن کا اندازِ تدریس و تعلیم جن خوبیوں سے آراستہ ہوا، وہ بہت کم اساتذہ کو نصیب ہوتا ہے۔ مطالعے کی تازگی اور عالمی ادبی تحریکات سے باخبری اُن کے شوق اور پیشے کی رفیقِ راہ رہی۔ یہی سبب ہے کہ اُنھوں نے اپنے درسوں اور مجلسوں میں شریک اپنے طلبہ میں ادب کا حقیقی ذوق بیدار کرنے اور ادب کی تفہیم و تعبیر کے مختلف زاویوں سے انھیں آشنا کرنے کا وظیفہ نہایت دیانت داری سے ادا کیا۔ مجلس آرائی کا شوق اُن میں کم کم تھا۔ وہ کم گو، مجتنب اور قدرے مردم بیزار آدمی تھے مگر اس کے باوجود معاصر ادبی منظر نامے پر گہری نظر رکھتے تھے اور وہ زمانے کے ساتھ ساتھ ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات اور میلانات سے پوری طرح باخبر رہے۔ ادبی معاملات میں اختلافِ رائے کی قدر و قعت اور اہمیت و افادیت کے وہ ہمیشہ قائل رہے۔ اُن کی تنقیدات میں اختلافِ رائے کی جلوہ سامانی اُن کے فکر و نگاہ کی انفرادیت کا پتا دیتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے طالب علموں میں بھی اختلاف رائے کا شعور بیدار کیا اور اُن میں ادب کو اپنے زاویے سے دیکھنے کی جرأت پیدا کی۔ بلاشبہ نظیر صدیقی جیسے صاحبِ کمال استاد صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور ان کے اعمال ال کی روشنی تادیر زمانوں کو روشن رکھتی ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی ۷, نومبر ۱۹۳۰ء کو صوبۂ بہار (انڈیا) کے ضلع چھپرا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سرائے ساہو میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت وہ نہایت کمزور تھے اور اُن کا تالو بہت زیادہ دھنسا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ نومولود کا زندہ رہنا مشکل ہے اور اگر خوش قسمتی سے یہ زندہ بچ گیا تو دماغ کی غیر معمولی کمزوری کے باعث تعلیم حاصل کرنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم رہے گا لیکن قدرت کی مہربانی کے باعث ڈاکٹروں کا یہ خیال اور اندازہ غلط ثابت ہوا اور نظیر صدیقی نے ستر سال کی طویل عمر پائی اور اپنی غیر معمولی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اُردو اور انگریزی میں دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جنھیں علمی و ادبی حلقوں میں قبولِ عام کا درجہ عطا ہوا۔ نظیر صدیقی کا نام محمد نظیر الدین صدیقی رکھا گیا۔ اُن کے والد شیخ ظہر الدین صدیقی اپنے زمانے کے میٹرک پاس تھے اور برما شیل کمپنی میں ملازم تھے۔ نظیر صدیقی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز چار سال کی عمر میں ہوا۔ ان کی تعلیم کے لیے گھر پر ہی ایک اتالیق کا بندوبست کیا گیا، جن سے انھوں نے دو سال تک بنیادی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انھیں گاؤں بھیج دیا گیا، گاؤں کے مکتب میں وہ دو سال تک پڑھتے رہے۔ یہیں اُنھوں نے قرآنِ حکیم اور اُردو کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں اُن کے والد کا تبادلہ جھریا (بہار) میں ہو گیا تو اُنھوں نے نظیر صدیقی کو گاؤں سے بلوا لیا اور جھریا اکیڈمی ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل کروا دیا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ ۱۹۴۱ء میں شہروں پر بمباری کے خطرے کے پیشِ نظر نظیر صدیقی کو دوبارہ گاؤں بھیج دیا گیا جہاں وہ دو سال تک اپنے گاؤں سے دو تین میل دُور ایک اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ ۱۹۴۳ء میں والد نے اُنھیں دوبارہ جھریا بُلوا کر جھریا اکیڈمی ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ اسی ادارے سے ۱۹۴۶ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان درجۂ دوم میں پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء میں میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج، گورکھ پور سے ایف اے کا امتحان بھی درجۂ دوم میں پاس کیا۔ اس دوران ہندوستان تقسیم ہو گیا تھا اور ان کے والدین ڈھاکا ہجرت کر گئے۔ نظیر صدیقی ایف اے کرنے کے بعد چند دن اپنی دادی اور اُن کے بھائی کے پاس گاؤں میں رہے پھر یکم جون ۱۹۴۸ء کو اپنے والدین کے پاس ڈھاکا چلے گئے۔ وہ بی اے اور ایم اے کی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کرنے کے متمنی تھے مگر تقسیم کے بعد کے حالات نے اُن کی اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا۔ مجبوراً انھیں ڈھاکا یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا۔ بی اے کرنے کے بعد وہ ایم اے انگریزی کرنا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر عندلیب شادانی کی خواہش اور مشورے پر ۱۹۵۰ء میں ایم اے اُردو میں داخلہ لے لیا۔ ایک سال بیماری کے باعث امتحان نہ دے سکے، یوں ۱۹۵۳ء میں ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کی۔ اُس سال درجۂ اوّل میں کامیاب ہونے والے وہ واحد طالب علم تھے۔ ۱۹۵۲ء کا سال نظیر صدیقی کی زندگی میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال انھوں نے بمبئی اور کلکتہ کے دس دس دن کے سفر کیے۔ بمبئی کے سفر میں اُنھیں معروف ترقّی پسند مصنفین جیسے: عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، آرزو لکھنوی اور کیفی اعظمی سے ملاقات کرنے اور ان کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۳ء میں ایم اے کا نتیجہ آنے سے پہلے ہی وہ نواب پور ہائی اسکول، ڈھاکا سے بطور استاد وابستہ ہو گئے۔ ایم اے میں شان دار کامیابی کے بعد اُن کی خواہش تھی کہ وہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہو جائیں تا کہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ وہ اپنے علمی و ادبی ذوق کی بھی آبیاری کر سکیں مگر کوشش کے باوجود اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اسکول کی ملازمت عارضی تھی، وہاں سے فارغ ہو جانے کے بعد اُنھیں واپڈا کے محکمے میں

کیشیئر کی حیثیت سے بھی کام کرنا پڑا، جو اُن کے مزاج سے کسی طرح ہم آہنگ نہ تھا۔ یکم دسمبر ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کی سعی و سفارش پر اُنھیں قائدِ اعظم کالج، ڈھاکا میں لیکچرار کی ملازمت ملی۔ اس کالج میں وہ چھے سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔ کالج کی انتظامیہ ابتدا میں اُنھیں ترقی پسند اور کمیونسٹ خیال کرتی تھی، جس کی وجہ سے اُنھیں تکلیف دہ ماحول میں رہنا پڑا۔ بعد ازاں ۱۹۶۰ء میں وہ ایک امریکن مشنری ادارے نوٹرے ڈیم کالج، ڈھاکا سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں اگرچہ تنخواہ پہلے سے قدرے کم تھی مگر ماحول بہتر تھا۔ نظیر صدیقی کی بدقسمتی کہ یہ بہتر ماحول بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اور اُنھیں ایک اذیت ناک ماحول کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس عرصے میں درس و تدریس کے پیشے سے ہی بیزار ہو گئے مگر جوں توں کر کے آٹھ سال تک اس ادارے میں وہ کام کرتے رہے۔ اس عرصۂ ملازمت میں وہ مدرسۂ عالیہ اور ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں جز وقتی اُستاد کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں اُن کی پہلی کتاب ''شُہرت کی خاطر'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اُن کے انشائیے، طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکے شامل ہیں۔ یہ کتاب اُن کے وسیع تر ادبی تعارف کا ذریعہ بنی۔ اگلے سال اُن کی پہلی تنقیدی کتاب ''تاثرات و تعصّبات'' شائع ہوئی، جس نے اُن کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ کیا۔

نظیر صدیقی کی شادی ۱۹۶۴ء میں فرحت پروین سے ہوئی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ڈھاکا کے حالات میں کشیدگی بڑھنے لگی اور بنگالی اور غیر بنگالی کی تقسیم نے متعصبانہ فضا پیدا کر دی۔ نظیر صدیقی پہلے ہی کالج کی گھٹن اور محدود آمدنی کے باعث پریشاں حال تھے۔ حالات کی ناسازگاری نے اُن کی تکالیف میں مزید اضافہ کیا۔ نظیر صدیقی نے اگرچہ مشکل سے پس انداز کی ہوئی رقم سے ڈھاکا میں رہنے کے لیے ایک مکان بنالیا تھا مگر اس میں اُنھیں سکون سے رہنے کا موقع نہ مل سکا۔ حالات کی سنگینی سے جان و مال کا خطرہ بڑھنے لگا اور اس صورتِ حال میں نظیر صدیقی نے ڈھاکا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جمیل الدین عالیؔ کی سعی و کوشش سے اُنھیں چھے سو روپے ماہوار تنخواہ پر اُردو کالج، کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت مل گئی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔ اُردو کالج کے انتظامی معاملات دِگرگوں تھے اور ملازمین کو بروقت تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ کراچی آکر بھی نظیر صدیقی کی مشکلات کم نہ ہوئیں، تنخواہ کم تھی اور بے قاعدہ بھی، اس لیے معاشی تنگی نے اُنھیں دو تین سال آزمائش میں رکھا۔ اسی عرصے میں دیناج پور (بنگلہ دیش) میں اُن کے جواں سال چھوٹے بھائی شفیق احمد کا بنگالیوں کے ہاتھوں بہیمانہ قتل ہوا، جس نے اُنھیں ذہنی طور پر مزید بکھیر کر رکھ دیا۔ آزمائش کے اس زمانے میں بھی بہتر ملازمت کے لیے وہ مسلسل تگ و دو کرتے رہے بالآخر اگست ۱۹۷۱ء میں اُنھیں اسلام آباد کے ایک سرکاری کالج میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی اور وہ کراچی کو خیر باد کہہ کر اسلام آباد آبسے۔ یکم مارچ ۱۹۷۶ء کو وہ ڈیپوٹیشن پر پیپلز اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے شعبۂ اُردو میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ مستقل طور پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا حصّہ بن گئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدرِ شعبۂ اُردو کے مناصب تک پہنچے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے زمانۂ ملازمت میں ایک بار فاصلاتی تعلیم کی تربیت کے لیے اُنھیں تین ماہ کے لیے لندن جانے کا موقع ملا، جس سے اُن کے دیرینہ شوقِ سیاحت کو تسکین ملی۔ لندن کے علاوہ بھی اُنھیں برطانیہ کے کچھ شہروں میں گھومنے پھرنے کا موقع ملا، جس کا احوال اُنھوں نے اپنے سفر نامے میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سیمی ناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں تین مرتبہ ہندوستان بھی گئے۔ ۲؍ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو ایک سال کے لیے وفاقی وزارتِ تعلیم نے اُنھیں پیکنگ یونیورسٹی، بیجنگ میں اُردو کے مہمان پروفیسر کے لیے نامزد کیا۔ چین میں اُن کا ایک سالہ قیام ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ یہاں وہ علمی اور تہذیبی ماحول اُنھیں میسر آیا، جس کا خواب وہ زندگی بھر دیکھتے رہے اور ڈھاکا، کراچی اور اسلام آباد کے تعلیمی اداروں میں اُنھیں کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ چین سے واپس آکر معاشی مشکلات پھر سے اُن کے گلے کا ہار بن گئیں۔ گھر کے اخراجات چلانے کے لیے پنشن کی محدود رقم ناکافی تھی۔ نظیر صدیقی نے پھر سے ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ اسلام آباد اور راول پنڈی ریڈیو پر پروگرام کرنے لگے اور پروفیسر ایرک سپرین کے مشورے سے ''دی مسلم'' اخبار میں انگریزی کالم لکھنے کا آغاز کیا۔ اپریل ۱۹۹۲ء میں قسمت آزمائی کے لیے ایک بار پھر کراچی پہنچے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن اور اُردو کالج سے جز وقتی وابستگی بھی حالات کی خرابی کو سدھارنے سے قاصر رہی۔ راول پنڈی کے انگریزی اخبار'' دی نیوز'' کی طلب پر اس میں ہفتہ وار کالم لکھنے لگے۔ ۵؍ فروری 1995ء کو کراچی سے وہ دوبارہ اسلام آباد آ گئے اور پھر زندگی کی آخری سانسوں تک اسی شہر میں حالات کی تلخیوں اور زندگی کے مسائل سے نبرد آزما رہے۔ زندگی کے آخری برسوں میں حالات کی ستم ظریفیوں کے ساتھ جسمانی عوارض اور مسائل بھی نظیر صدیقی کے لیے اذیت اور تکلیف کا باعث بنتے رہے۔ اسی زمانے میں کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے سے پریشان حالی کا شکار ہوئے۔ آخری دنوں میں پھیپھڑوں کی بیماری نے سانس کے مسائل کو ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ پروفیسر نظیر صدیقی اکہتر سال کی عمر میں زندگی سے لڑتے لڑتے بالآخر ۱۲؍ اپریل ۲۰۰۱ء کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اسلام آباد کے مرکزی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔(۱)

نظیر صدیقی نے طالب علمی کے زمانے میں ادب کے کوچے میں قدم رکھا۔ جھریا اور گورکھ پور کے قیام کے زمانے میں اُنھوں نے اپنا باقاعدہ تخلیقی سفر آغاز کیا اور ادبی حلقوں میں آنے جانے لگے۔ اُن کے ابتدائی ادبی دوستوں میں غیاث احمد گدی، موہن لال شیدا اور شمیم کے نام شامل ہیں۔ گورکھ پور میں وہ مجنوں گورکھ پوری کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہونے کی آرزو رکھتے تھے مگر مجنوںؔ سے قریب ہونے کا اُنھیں موقع نہ مل سکا۔ البتہ مہدی الافادی اور رشید احمد صدیقی کی محبت کا سفر یہیں گورکھ پور میں پروان چڑھا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ اپنے والدین کے پاس ڈھاکا چلے گئے اور صحیح معنوں میں اُن کی ادبی زندگی کا آغاز یہیں سے ہوا۔ ڈھاکا میں اُنھیں ڈاکٹر عندلیب شادانی کی سرپرستی اور رہنمائی میسّر آئی اور اُنھی کی تشویق اور تحریک پر اُنھوں نے انگریزی کے بجائے ایم اے اُردو میں داخلہ لیا۔ ایم اے کی تعلیم کے زمانے میں اُنھیں کلکتہ اور بمبئی جانے کا موقع ملا۔ بمبئی میں وہ ممتاز ترقی پسند اہلِ قلم سے ملے، جس نے اُن کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ ڈھاکا میں اُن کا شمار فعال اور متحرک ادیبوں میں ہوتا تھا۔ وہ ڈھاکا کی ادبی تنظیموں دائرۂ ادب اور حلقۂ اربابِ ذوق کے سرگرم رُکن رہے۔ اُنھیں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے علاوہ افسر ماہ پوری، محبوب خزاں، حنیف فوق، عابد دانا پوری، شوکت سبزواری اور طاہر فاروقی جیسے معروف اہلِ قلم کی قربت اور صحبت میسّر رہی۔ وہ شاعری کے علاوہ انشائیہ، خاکہ، مضمون اور تنقید کے میدانوں میں یکساں سہولت کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے اور آگے بڑھتے رہے۔ مغربی ادبیات کے گہرے مطالعے نے اُن کی فکر اور نگاہ کو عمق اور کشادگی عطا کی۔ اس میں شُبہ نہیں کہ ادب کے مختلف شعبوں میں اُن کی تخلیقات اپنا انفرادی ذائقہ رکھتی ہیں اور ان کے معاصرین اور ناقدینِ ادب نے اُن کا اعتراف بھی کیا تاہم اُن کی تین ادبی جہات: تنقید، انشائیہ نگاری اور شاعری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں ادبی میدانوں میں اُن کی خدمات اور اُن کے انفرادی نقوش کا اجمالاً ذکر کیا جائے۔

نظیر صدیقی کی ادبی شناخت کا سب سے معتبر حوالہ اُن کی تنقید ہے۔ اُن کی تنقید کسی دبستانِ نقد کی مقلد نہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر رہے، جس کا خود اُنھوں نے اعتراف بھی کیا ہے مگر ان کی تنقید ترقی پسند اندازِ نقد سے یکسر مختلف ہے۔ ترقی پسند تنقید، ادب کی افادیت اور مقصدیت کی قائل ہیں اور اُس کے نزدیک ادب سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اس زاویۂ نگاہ کے برعکس نظیر صدیقی کی تنقید ادب کی جمالیات اور اس کی ادبیت سے سروکار رکھتی ہے۔ ادب کی جمالیاتی تعبیر کے اعتبار سے اُن کا رشتۂ تنقید کسی حد تک حلقۂ اربابِ ذوق کی تنقید سے جُڑ جاتا ہے مگر وہ حلقۂ اربابِ ذوق کے ناقدین کی طرح روایت کے منحرف اور اس کے باغی نہیں بلکہ وہ روایت کی صحت مند قدروں کو ادب کی تعمیر و تشکیل کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ روایت کے احترام کے باعث نظیر صدیقی جدیدیت سے بھی ایک فاصلے پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ جدیدیت روایت کے انہدام پر اپنی بنیاد اُٹھاتی ہے۔ جدیدیت کا حامل ادب جس ابہام اور تجریدیت کو اپنا تشخص قرار دیتا ہے وہ نظیر صدیقی کے نزدیک کسی صورت مستحسن نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُنھوں کے جدیدیت کے حامل ادب پر کڑی تنقید کی ہے اور ان جدید ناقدین کے بھی لتّے لیے ہیں، جو مہمل اور بے معنی شاعری اور ادب کو نفسیاتی اور فلسفیانہ جواز مہیا کر کے قدر و قیمت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ نظیر صدیقی نے تنقید کے نظری مسائل و مباحث اور اس کی فلسفیانہ اساس پر بہت کم لکھا ہے، ان کی زیادہ تر دل چسپی عملی اور تجرباتی تنقید میں رہی ہے۔ اُنھوں نے اگرچہ تنقید کی کئی یک موضوعی کتابیں جیسے: ''جدید اُردو غزل، ایک مطالعہ''، ''ڈاکٹر عندلیب شادانی'' اور ''اُردو ادب کے مغربی دریچے'' لکھیں مگر اُن کے متفرق تنقیدی مضامین کی تعداد زیادہ ہے اور اُن کی تنقید کا رنگ خاص اُن مضامین کے ذریعے زیادہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اُن کی اہم اُردو اور انگریزی تنقیدی کتابوں کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

اُردو کتابیں:

☆	تاثرات و تعصّبات	☆	میرے خیال میں
☆	تفہیم و تعبیر	☆	اُردو ادب کے مغربی دریچے
☆	جدید اُردو غزل	☆	ڈاکٹر عندلیب شادانی
☆	اُردو میں عالمی ادب کے تراجم	☆	ادبی جائزے

انگریزی کتابیں:

☆ Iqbal and Radhakrishnan

☆ Reflections on Life and Literature

☆ Views and Reviews

☆ Iqbal: in his Varied Aspects

☆ Glimpses of the East and West in Literature

پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنی تنقیدات میں مطالعے کی وسعت وثروت اور ذوق کی ہمہ گیری وپاکیزگی کا جادو جگایا ہے۔ وہ فن پارے کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے، اُس کے حسن وقبح کو نمایاں کرتے ہیں اور اس کی قدر وقیمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اُن کے اکثر فیصلے اُن کی فکر ونظر کی انفرادیت کو سامنے لاتے ہیں۔ اُنھیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اُن کے فیصلوں سے دوسرے لوگ اختلاف کرتے ہیں یا اتفاق۔ اُن کا اسلوب اور زبان تنقید کو شگفتگی کا ایسا ذائقہ عطا کرتی ہے جو دوسرے ناقدین کے ہاں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ نظیر صدیقی کے تنقیدی کام کا ایک بڑا حصّہ انگریزی میں ہے۔ اخبارات کے لیے اُنھوں نے جو انگریزی کالم لکھے، وہ بھی اُن کی تنقیدی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں۔ علامہ اقبال پر اُن کی دو تنقیدی کتابیں بھی انگریزی میں ہیں۔ اقبال کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ فکرِ اقبال کے بعض پہلوؤں کے شدید ناقد ہیں اور اپنی کتابوں میں اُنھوں نے اپنے اس زاویۂ نظر کو بے باکی اور سچائی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرت، مطالعے کی گہرائی، تجزیے کی صداقت، اظہار کی دل پذیری اور اسلوب کی ہمہ رنگی کا اعتراف تمام بڑے اور مختلف تنقیدی دبستانوں سے وابستہ ناقدین نے کیا ہے۔ ذیل میں اُردو کے چند اہم تر ناقدین کی مختصر آرا پیش کی جاتی ہیں:

پروفیسر آل احمد سرور:

''نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اُن کا مطالعہ وسیع ہے اور ذوق پاکیزہ۔ گو اُن کی بعض رایوں سے اختلاف ناگزیر ہے مگر اس کے باوجود اُنھیں طرف داروں کے بجائے سخن فہموں کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایمان داری سے قدر شناسی (Appreciation) کی کوشش کرتے ہیں۔ حسن وقبح کو پرکھتے ہیں اور اس کے بعد ایک فیصلہ بھی صادر کرتے ہیں۔ فیصلے سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن اُن کے طریقہ کار سے اختلاف کی کم ہی گنجائش ہے۔ اُنھیں اپنے خیالات کو صاف ستھری زبان میں پیش کرنے کا گر آتا ہے اور زبان کی اس دل کشی کی وجہ سے اُن کی تحریروں کو پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔''(۲)

پروفیسر احتشام حسین:

''نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین تنقید میں ایک معیار کی جستجو کا پتا دیتے ہیں۔ یہ ان کے صحیح الذوق ہونے کی نشانی ہے۔ اُن کی نظر وسیع اور مطالعہ گہرا ہے اور اندازِ بیان میں تازگی ہے۔ ایسی تازگی جو مخلصانہ اظہارِ خیال کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔'' (۳)

ڈاکٹر وزیر آغا:

''آپ کے ہاں اسلوب اور خیال دونوں میں اُلجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہوتی۔ ہر مسئلے کے بارے میں آپ کا ذہن بالکل واضح ہوتا ہے اور بات، آپ بڑی خوب صورتی سے کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مضامین تنقید کے انبار سے الگ نظر آتے ہیں۔''(۴)

سلیم احمد:

''نظیر صدیقی کی تحریروں سے جہاں اُن کی وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں ادب اور ادبی مسائل پر گہرے غور وفکر کا پتا بھی چلتا ہے۔ وسیع معلومات کے نام پر وہ سرسری مطالعے کے نتائج پیش نہیں کرتے اور غور وفکر کے معنی اس کی سنجیدہ شگفتگی ہے۔ یہ تحریر حد درجہ بین اور ثقہ ہونے کے باوجود ٹھس، بے کیف اور بے رنگ نہیں ہے۔''(۵

نظیر صدیقی کی انشائیہ نگاری بھی اُن کی تخلیقی شخصیت کا ایک اہم ترین مظہر ہے۔ یہ صنف مغرب سے اُردو ادب میں آئی ہے اور مغرب میں اس کے لیے Light Essay یا Personal Essay کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اُردو میں انشائیے کا باقاعدہ آغاز تو بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں ہوا تاہم انیسویں صدی کے ربعِ آخر سے ایسی تحریریں سامنے آنے لگیں، جن میں بہت سارے انشائی عناصر ملتے ہیں۔ بعض محققین کے بقول سرسید احمد خاں کے کئی مضامین باقاعدہ انشائیے کی تعریف پر پورے اُترتے ہیں۔ اسی طرح خواجہ حسن نظامی کی اکثر تحریروں کو انشائیہ قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور مشکور حسین یاد نے دو الگ الگ دبستانوں کی حیثیت سے پاکستان میں انشائیہ نگاری کو فروغ دیا۔ دونوں دبستانوں میں کئی عناصر کے اشتراک کے باوجود اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر نظیر صدیقی انشائیے کے میدان میں ان دونوں دبستانوں سے الگ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ بلاشبہ اُردو میں باقاعدگی سے انشائیہ لکھنے والوں کی پہلی قطار میں شامل ہیں۔ اُنھوں نے پچاس کی دہائی میں انشائیہ نگاری آغاز کی اور اُن کا انشائیوں کا مجموعہ ''شہرت کی

خاطر" ۱۹۶۱ء میں ڈھاکا سے شائع ہوا۔اس زمانے میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں انشائیے پر بحث مباحثے کا سلسلہ زوروں پر تھا۔نظیر صدیقی کا خیال تھا کہ بحث کے اکثر شرکا کے ذہنوں میں انشائیے کا واضح تصور موجود نہیں ہے اور وہ مزاحیہ وطنزیہ مضمون کو انشائیہ خیال کرتے ہیں۔"شہرت کی خاطر" کے پیش لفظ میں وہ اس بارے میں لکھتے ہیں :

"آج کل اُردو ادب میں انشائیے کے فن سے جس قدر دل چسپی کا اظہار کیا جارہا ہے،اس کے باوجود مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے، جیسے اکثر لوگوں کے ذہنوں میں اس فن کا صحیح اور واضح تصوّر موجود نہیں۔غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ انشائیہ کو مزاح نگاری اور طنز نگاری کا مترادف سمجھتے ہیں۔انشائیہ عموماً طنز و مزاح کے عناصر سے خالی نہیں ہوتا پھر بھی اسے طنز نگاری یا مزاح نگاری کا مترادف سمجھنا صحیح نہیں۔"(۶)

اُن کے خیال کے مطابق مغرب میں بعض ناقدین انشائیہ اور مضمون میں فرق روا نہیں رکھتے اور وہاں بھی کہیں Light Essay اور کہیں Personal Essay کو انشائیہ خیال کیا جاتا ہے۔ان دونوں میں مشترک عناصر زیادہ ہیں مگر محض Essay کو بھی انشائیہ کہنا کسی طرح درست نہیں۔وہ انشائیہ کے بارے میں کیا تصور رکھتے تھے،اس کا اظہار بھی انھوں اپنے انشائیوں کے اولین مجموعے میں کیا ہے۔اُن کے نزدیک :

"انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔یہ وہ صنفِ ادب ہے،جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کیے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔یعنی Sense میں Nonsense اور Nonsense میں Sense ڈھونڈا جاتا ہے۔یہ وہ ادبی صنف ہے،جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ ہوتا ہے اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ۔یعنی بالالفاظِ غالب لکھنے والی کی بے خودی میں ہُشیاری اور ہُشیاری میں بے خودی پائی جاتی ہے۔یہ ادب کی وہ صنف ہے،جس میں کہیں سچ میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے اور کہیں جھوٹ میں سچ کی۔یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اُچھالی جاتی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کے نام بھی۔یہ وہ صنفِ ادب ہے،جس میں لکھنے والا نہ صرف دوسروں کی کمزوریوں پر ہنستا ہے بلکہ اپنی کمزوریوں پر دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔یہ وہ صنفِ ادب ہے،جس میں تفریح اور تنقید ایک دوسرے سے بغل گیر نظر آتی ہے اور بصیرت و ظرافت ایک دوسرے کی سگی بہنیں معلوم ہوتی ہے۔یہ وہ صنفِ ادب ہے،جس میں عنوان اور نفسِ مضمون میں وہی نسبت ہے جو کھونٹی اور لباس میں ہے۔"(۷)

اُردو میں انشائیہ کے دو متحرک اور فعال دھڑوں کے باوجود اُنھوں نے اپنی انشائیہ نگاری کے جوہر کو منوایا۔اُن کے انشائیوں میں اُن کی شخصیت کے کئی رنگ پوری طرح متشکل ہوئے۔اُنھوں نے اپنے غم و غصّے کو بجا طور پر اپنے انشائیوں کی توانائی قرار دیا ہے۔خدا، سماج اور زندگی کے مسائل پر اُن کے ہاں جو طنزیہ رنگ ملتا ہے وہ اُن کے انشائیوں میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔زبان کی تازگی اور شگفتگی نے ان کے انشائی اسلوب کو ایک خاص نوع کی سرشاری دی ہے،جسے مقتدر علمی و ادبی شخصیات نے پسند کیا اور اس کی تحسین کی۔مناسب ہے کہ نظیر صدیقی کے انشائیوں سے کچھ اقتباس درج کیے جائیں تا کہ قاری اُن کے اسلوبِ انشائیہ سے کسی حد تک واقف ہو سکیں:

"مرحوم اپنے ملک کے مستقبل سے صرف اس لیے مایوس ہو گئے تھے کہ یہاں کے لوگوں کو سڑک پر چلنے تک کا ڈھنگ نہیں آتا۔اکثر کہا کرتے کہ جس ملک میں لوگ کاندھے پر چھاتا رکھ کر یا بغل میں چھتری دَبا کر آگے پیچھے،دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک پر چلنے کے عادی ہوں،وہ ملک سقراط و بقراط پیدا کر لے لیکن تہذیب و ترقّی کے اعلیٰ منازل ہر گز طے نہیں کر سکتا۔"(۸)

"میرا خیال ہے اور غالباً سبھی کو اتفاق ہو گا کہ کسی سے لڑائی مول لینا اتنا دشوار نہیں،جتنا کسی سے دوستی کو بناہ لے جانا۔لڑائی مول لینے میں صرف اس بات کی احتیاط رکھی جاتی ہے کہ دشمن کا سر پھُوٹے تو پھوٹے کم سے کم اپنا سر تو محفوظ رہے لیکن دوستی کے نباہ میں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔یعنی اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ اپنا دل ٹوٹے تو ٹوٹے لیکن دوست کا دل ہر گز ٹوٹنے نہ پائے خواہ بیوی سے رشتہ ٹوٹنے کے قریب کیوں نہ آجائے۔"(۹)

"جو لوگ بور ہونے کی حیثیت سے مشہور و مستند ہو جاتے ہیں،اُن کی ایک ہولناک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اُن سے اُن کے ملنے والوں اور جاننے والوں کو نجات کسی قیمت پر میسّر نہیں آتی۔اگر آپ اُن سے بچنے کے لیے گھر میں نہ ہونے کا بہانہ کریں تو کسی دن کسی وقت وہ آپ کو بازار میں گھیر لیں گے اور اگر بازار میں اُن کی نظر بچا کر اپنے گھر کی طرف بھاگیں تو گھر میں داخل ہونے کے پانچ ہی منٹ بعد وہ آپ کے دروازے پر دستک دیتے سُنائی دیں گے۔اس وقت آپ کو پتا چلے گا کہ آپ نے تو ان سے نظر بچائی تھی لیکن اُن کی نظر آپ سے نہ بچ سکی۔"(۱۰)

پروفیسر نظیر صدیقی کی ادبی اور تخلیقی شخصیت کا ایک اور اہم شعبہ اُن کی شعر گوئی ہے۔اُنھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی شاعری سے کیا، بعد میں وہ نثر نویسی اور تنقید کی طرف آئے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا کہ اُن کی تنقید نے اُن کی شاعری کا راستہ مسدود کر دیا۔ وہ غزل کے ایک زیرک نقاد اور اس کی صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت کے عارف ہیں مگر اس شرف کے باوصف اُن کی غزل مختلف ہونے کے باوجود کم کم متاثر کرتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا بڑا سبب اُن کی غزل میں حد سے بڑھی ہوئی سادگی ہے جو کہیں کہیں سپاٹ ہو جاتی ہے۔اُن کی غزل میں متخیلہ کے پَر بندھے ہوئے ہیں اور وہ اپنی ناآسودہ اور پریشاں حال زندگی کی صاف اور سادہ تصویریں پیش کر دیتے ہیں۔آرائشی اور زیبائشی عناصر کے استعمال اور علمِ بیان و بدیع کے اظہاری وسیلوں سے بھی اُنھوں نے زیادہ تعلق نہیں رکھا۔ وہ معاصر غزل کے موضوعات، اسالیب اور رنگ وآہنگ سے بھی خاصے فاصلے پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور غزل کو محض طبیعت کے تقاضے اور باطن کی خواہش کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔اُن کی ابتدائی غزل یاسیت اور قنوطیت کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ بعد میں اُن کی غزل پر ایک مخصوص طرز کا حکیمانہ رنگ سایہ فگن دکھائی دیتا ہے۔ تفکر، فلسفیانہ آہنگ اور استدلالی انداز نے اُن کی غزل سے جذبے کی سرشاری اور وارفتگی کو گھٹانے کا اہتمام کیا ہے۔البتہ اس عہد کی غزل ہیں اپنے ماحول، سماج اور خدا سے چھیڑ چھاڑ اور طنز کا رنگ قدرے اُبھر کر سامنے آیا ہے۔خاص طور پر خدا سے چھیڑ چھاڑ کا رنگ اُن کی شاعری میں زیادہ ملتا ہے مگر یہ چھیڑ چھاڑ کسی رند یا عارف کی چھیڑ چھاڑ نہیں۔زندگی کے مسائل سے چُور اور معاشی مسائل میں گھرے ہوئے بے بس بندے کی چھیڑ چھاڑ ہے جو اپنی اس کم سامانی اور بے کسی کو اس کی رزّاقی پر طنز خیال کرتا ہے۔ جو اپنی محرومیوں اور ناآسودگیوں کو اس کا تغافل سمجھتا ہے۔ نظیر صدیقی نے زندگی کے درد و غم اور آلام و مصائب کو اپنی شاعری کی توانائی نہیں بننے دیا بلکہ حسرت و ناکامی اور مایوسی و نامرادی کی تعمیر میں صرف کیا۔اُن کا شاعرانہ اسلوب ایک خاص طرح کے تہوّر اور گونج کا حامل ہے مگر اس میں میرزا یگانہ کی طرح جلال و جمال کے بجائے جھنجلاہٹ اور تلخی کا رنگ نمایاں ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی نے بہت کم سرمایۂ سخن یادگار چھوڑا۔اُن کا ایک ہی مختصر مجموعہ ''حسرتِ اظہار'' کے عنوان سے شائع ہوا جو محض چھیانوے صفحات پر محیط ہے۔ وہ اپنی شاعری کے حوالے سے اہلِ نقد و نظر کی عدم توجہی پر دل گرفتہ رہے۔ان کے مختصر سے شعری اثاثے میں اچھے شعروں کی کمی نہیں۔''حسرتِ اظہار''(۱۱) سے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

ترے کرم کے فسانے بہت سُنے یارب!
ہماری کوئی دُعا تُو نے بھی سُنی ہوتی

جو لوگ موت کو ظالم قرار دیتے ہیں
خدا ملائے اُنھیں زندگی کے ماروں سے

دلِ مایوس کو اس سے بھی سکوں ملتا ہے
اُس کی قربت نہ سہی، دُور سے دیدار سہی

دل چاہتا ہے تیری ندامت کو دیکھ کر
تُو مجھ سے بات بات پہ برہم ہوا کرے

اُمیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے بُجھ گئے شاید
مگر یہ کیا کہ بزمِ آرزو برہم نہیں ہوتی

سویا ہوا ضمیر ہے، جاگی ہوئی ہوس
اے رات! تیرے پاس کچھ اس کے سوا بھی ہے

وہ قیامت جو سر سے گزری ہے
دیکھیے کب شعور سے گزرے

کر چکے ترکِ آرزو پھر بھی
اِک تری جستجو سی رہتی ہے

حوالہ جات:

(۱) سوانحی حالات کے لیے ناصر عباس نیّر کی کتاب: ”معمارِ ادب: نظیر صدیقی“ مطبوعہ ۲۰۰۳ء اور فرحت پروین ملک اور احمد زین الدین کی مرتبہ کتاب ”حرفِ تازہ بیاد نظیر صدیقی“ مطبوعہ ۲۰۰۵ء سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۲) ”تاثرات و تعصبات“ از پروفیسر آل احمد سرور مشمولہ: حرفِ تازہ بیاد نظیر صدیقی؛ فرحت پروین ملک و احمد زین الدین؛ کراچی؛ زین پبلی کیشنز؛ اپریل، ۲۰۰۵ء؛ ص ۱۶۰۔

(۳) نامے جو مرے نام آئے: مصطفی راہی (مرتب)؛ راول پنڈی؛ اشاعتِ ادب؛ جون ۱۹۸۴ء؛ ص ۹۷۔

(۴) ایضاً: ص ۲۱۲۔

(۵) نذرِ نظیر: جاوید وارثی و ڈاکٹر محمد محسن؛ کراچی؛ بساطِ ادب؛ ۱۹۹۸ء؛ ص: ۱۸۶۔

(۶) شہرت کی خاطر: نظیر صدیقی؛ ڈھاکا؛ پاک کتاب گھر؛ اپریل ۱۹۶۱ء؛ ص: ۹۔

(۷) ایضاً: ص: ۱۱، ۱۰۔

(۸) ”نظیر صدیقی مرحوم“ مشمولہ: شہرت کی خاطر؛ ص: ۴۸۔)(دوست اور دوستی: ص ۷۹)(بور: ص ۹۵(

(۹) ”دوست اور دوستی“ مشمولہ: شہرت کی خاطر؛ ص: ۷۹۔

(۱۰) ”بور“ مشمولہ: شہرت کی خاطر؛ ص: ۹۵۔

(۱۱) حسرتِ اظہار؛ نظیر صدیقی؛ اسلام آباد؛ ماڈرن بک ڈپو؛ نومبر، ۱۹۷۷ء۔